قرآن کریم کی کچھ آیات جن کی تفہیم اب آسان ہے

سید غلام حیدر

قرآن کریم وہ مقدس صحیفہ الٰہی ہے، جس کے بارے میں فقط مسلمانوں ہی نہیں بلکہ غیرمسلموں اور دور جاہلیت کے عربی زبان وادب کے ماہرین بھی یہ اعتراف کرچکے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، بلکہ یہ خالق ومالک کائنات کا کلام ہے، جس کے نزول کا مقصد دنیائے بشریت کی ہدایت ورہنمائی ہے۔ خداوند عالم نے اپنی اس کتاب میں مختلف النوع علوم وفنون اور قیامت تک نبی نوع انسان کے کام آنے والی تمام لازمی معلومات جمع کردی ہیں ۔ جیسے جیسے انسانی فکر کو فروغ حاصل ہوگا وہ قرآنی رموز سے واقف اور اس سے بھرپور استفادہ کرتی رہے گی۔ زیرنظر مقالہ کے ذریعہ انسانی علوم کی دو اہم شاخوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ ان میں سے ایک علم فلکیات (Astronomy)اور دوسری شاخ علم سماجیات پر مبنی ہے۔ (Sociology)جس کی جدید ترین شاخ یعنی علم آبادیات ہے۔

فلکیات (Astronomy)

قرآن کریم میں اس سلسلے میں جگہ جگہ متعدد آیات ملتی ہیں۔ جن سے فلکیات ، سورج ، چاند ، ستاروں، سیاروں اور دوسرے اجرام فلکی پر براہ راست یا بالواسطہ روشنی پڑتی ہے ۔ مثال کے طور پر وَعَلاَمَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ،(سورہ نحل : ۱۶)

یعنی بہت سی نشانیاں اور بہت سے لوگ ستارے سے بھی راہ معلوم کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِی جَعَلَ لَكُمْ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِی ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ☆

اور وہ وہی ہے جس نے تمہارے واسطے ستارے پیدا کئے تاکہ تم جنگلوں اور دریاؤں کی تاریکیوں میں ان سے راہ معلوم کرو۔

اس سلسلے میں قرآن کریم میں جتنی بھی آیات سورج اور چاند سے متعلق ملتی ہیں ،ان سے

ایک بات واضح طور پر عیاں ہے۔ کہ ان دونوں سے ظاہر ہونے والی روشنی میں فرق ظاہری طور پر بھی ہمیں محسوس ہوتا ہے اور اب سائنٹفک نقطہ نظر سے بھی یہی ثابت ہو چکا ہے۔ درج ذیل چند آیات سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی:

۱۔ هُوَ الَّذِی جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذَلِكَ إِلاَّ بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ☆ (یونس :۵) (جس نے آفتاب کو چمک دار اور مہتاب کو نور (روشن) بنایا)۔

۲۔ تَبَارَكَ الَّذِی جَعَلَ فِی السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا (سورہ الفرقان: ۶۱)

(بابرکت ہے وہ خدا جس نے آسمان میں بروج اور ان برجوں میں (آفتاب کا) چراغ اور پرنور چاند بنایا)

۳۔ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (نوح : ۱۶)

(اور اس نے چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا)

۴۔ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا (النباہ: ۱۳) (اور ہم نے سورج کو روش چراغ بنایا)

۵۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ (الشمس : ۱، ۲)

(سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی اور چاندی کی جب اس کے پیچھے نکلے۔)

اگر ہم غور سے دیکھیں تو ان پانچ آیتوں میں سورج کی چمک کو ایک جگہ ضیاء، تین جگہ سراج، چراغ اور ایک جگہ روشنی سے تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ پہلی تین آیتوں میں چاند کے لئے نور یا منیر، جو ایک ہی مصدر کے الفاظ ہیں۔استعمال ہوئے ہیں۔عربی لغت کی نزاکتوں اور الفاظ کے تہہ بہ تہہ معنوں کی بحث سے بچتے ہوئے، اتنی بات تو بہر طور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ سراج، یا چراغ جلتا ہے اور اس کے جلنے سے ہی ضیاء یا روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں تپش اور سوزش کا عنصر لازمی ہے، جبکہ نور کے معنوں میں، روحانی مطالب سے قطع نظر بھی ایک طرح کا سکون، لطافت اور ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ پورے قرآن شریف میں کہیں بھی سورج اور چاند کی روشنی کے اس فرق میں کوئی خلط مبحث (mixup) نہیں ہے۔

ممکن ہے بادی النظر میں یہ بات اہم محسوس نہ کی گئی ہو، اور اسے صرف دونوں روشنیوں کی

ظاہری کیفیت پر محمول کیا گیا ہو اور اس کے ہیئتی فرق پر توجہ نہ کی گئی ہو، مگر اب جبکہ پورے وثوق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سورج آگ کا ایک گولا ہے اور چاند میں جو بھی چمک دمک ہے وہ اس کی اپنی نہیں صرف سورج کی شعاعوں کا انعکاس ہے، تو اس بات کو اتنے صاف طور پر یا Clarity کے ساتھ کہہ دینا یقیناً قرآن شریف کے محکم ہونے کی ایک دلیل ہے۔ یہ تو نہیں کہ جاسکتا کہ ساتویں صدی کی عام دنیا میں فلسفیانہ طور پر چاند اور سورج کی روشنی کے بارے میں کیا موقف تھا، تاہم اتنی بات تو یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ جن لوگوں کو رسول اللہ ﷺ نے پہلی بار آیات سنائی ہوں گی، ان میں تو مشکل سے ہی ایسا کوئی شخص رہا ہوگا، جس کو اس علم سے کوئی سروکار ہو۔

اوپر پیش کی گئی چوتھی آیت والقمر اذا تلھا میں لفظ تلا ، کے معنی لغت میں پیچھے آنا، نقش قدم پر چلنا ، تابع ہونا، پیروی کرنا، وغیرہ وغیرہ بتائے گئے ہیں۔ اس آیت کو عام طور پر دن اور رات کے ایک دوسرے سے پیوست ہونے کے معنوں میں لیا جاتا ہے ، یعنی سورج غروب ہونے کے بعد چاند نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اشارہ ہو ان دو اجرام فلکی کے آسمان میں آپسی رشتے یا حرکت کی طرف یعنی چاند کا سورج کی پیروی کرنا اور نظام شمسی میں اس کا سورج کا تابع ہونا۔

آج کی دنیا میں تیسری چوتھی جماعت کا بچہ بھی یہ جانتا ہے کہ دنیا اور دوسرے سیارے سورج کے اردگرد گھومتے ہیں اور چاند دنیا کے اردگرد گھومتے ہوئے سورج کے گرد بھی چکر لگاتا ہے ۔ مگر ساتویں صدی میں اس تصور یا اس کی تاریخ میں بہت خلط ملط یا confusion تھا ۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایک یونانی فلسفی کا تصور تھا کہ دنیا گول ہے اور وہ ایک مرکزی آگ کے گولے (جو سورج نہیں تھا) کے اردگرد گھومتی ہے ۔ ۲۷۰ ق،م میں ایک فلسفی نے باقاعدگی سے یہ کہا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یعنی نظام شمسی میں سورج مرکزی حیثیت رکھتا ہے ۔ جسے شمسی المرکز (Heliocentric) سسٹم کہتے ہیں۔ کوئی میں سو سال بعد دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس (Ptolomey) نے زمین کو مرکز مان کر اسے ساکت قرار دیا اور تمام اجرام فلکی کو ، جس میں سورج بھی شامل تھا، اس کے گرد گھومتا ہوا مانا۔ اسے ارضی المرکز (Geocentric) سسٹم کہتے ہیں۔ یہ تصور یہاں تک مقبول ہوا کہ یہ کلیسا کا بھی عقیدہ بن گیا ۔ ایک طویل عرصے تک اس کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ تقریباً بارہ سو سال اس تصور کا راج رہا۔ جس وقت قرآن شریف نازل ہوا۔ یہی عقیدہ فلسفیان کلیسا اور عوام میں بلاشبہ تسلیم کیا جاتا تھا ۔ کاپرنیکس نے پھر سورج کو مرکز

اور باقی اجرام فلکی کو اس کے گرد چکر لگانے والا مانا، مگر اس کی زندگی میں اس کی اشاعت نہیں ہوسکی۔ پھر کچھ موافقت اور مخالفت کے بعد گیلیلیو نے کاپرنیکس کے سسٹم کو تسلیم کیا، جس پر کلیسا نے مقدمہ چلایا اور مجبوراً اسے بھی اپنا تصور ظاہری طور پر سہی مگر منسوخ کرنا پڑا۔ بعد میں ساری دنیا کو اسی نظریے کو تسلیم کرنا پڑا۔

مگر قرآن شریف نے ساتویں صدی میں ہی والقمر اذاتلھا کہہ کر بات بالکل صاف کردی تھی ۔ اس وقت لوگوں نے اسے آمنا وصدقنا کے جذبے کے تحت اور کچھ ظاہری شواہد کی بنیاد پر قبول کرلیا تھا۔ فلکیات کے نقطہ نظر سے عام لوگوں نے اس پر توجہ ہی نہ دی ہوگی۔ بہرطور، اب یہ بات ہر طرح کے مشاہدات وتجربات سے بلاشبہ ثابت ہوچکی ہے۔ یہ بھی قرآن کی حقانیت کا ایک ثبوت ہے۔

سماجیات (Sociology)

اس نام سے علم کی یہ شاخ خواہ کتنی ہی جدید مانی جائے مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ بھی دنیا میں قدیم ترین موضوعات میں سے رہی ہے۔ قرآن کریم ، اپنی روح اور متن کے اعتبار سے سماجیات کی جیسی مکمل اور جامع کتاب ہے کہ کوئی دوسری کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اسی سماجیات کی ایک جدید ترین شاخ آبادیات کا مطالعہ (Demography) بھی ہے۔ علم کی ایک باقاعدہ شاخ کے طور پر اس کی عمر مشکل سے ڈیڑھ دوسو سال ہوگی۔

سورہ نساء کی پہلی آیت ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَائَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (النساء ـ ۱)

(اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک نفس (شخص) سے پیدا کیا اور ان سے ان کی بیوی کو پیدا کیا او انہیں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں)

اس آیت میں خلق منھا زوجھا کے سلسلے میں مترجمین ومفسرین میں جو اختلاف رائے ہے اس سے کوئی غرض نہیں ہے ، اس کے صرف آخری حصے وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثيرا وّنِسَاء پر اپنا خیال ظاہر کرنا ہے۔

یہ بہت نازک سا خیال ہے ، خدا کرے میں اس خیال کو قابل فہم بھی بنا سکوں اس ٹکڑے کا اگر خالص تحت اللفظ ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا : اور پھیلائے ان دونوں سے مرد بہت سے اور عورتیں

،ملحوظ رہے کہ رجالا کے بعد کثیراً ہے نساء کے بعد نہیں اور یہی میرا نکتہ بحث ہے۔

اردو کے تین ترجموں (مولانا فرمان علی صاحب ، مولانا مقبول احمد صاحب اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب) دیکھے جن سب میں بہت سے مرد اور عورتیں کہا گیا ہے انگریزی کے دو ترجموں (عبد اللہ یوسف علی اور ایم۔ ایچ شاکر) میں سے اول الذکر نے Countless men and women اور ثانی الذکر نے Many men and women ترجمہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم عام طور پر اس سے یہی مطلب لیتے ہیں۔

یقیناً نہ میری حیثیت نہ اتنا علم کہ میں ایسے علماء پر کسی اعتراض کی جرائت کروں۔ مگر مجھے تلاوت کرتے وقت ایک دن خیال آیا کہ اردو اور انگریزی میں اس جملے کی قدرتی ساخت (اگر ہم دونوں صنفوں کی کثرت کو مساوی سمجھیں) ایسی ہوگی جس میں مرد اور عورتیں سے یا تو پہلے بہت سے آئے یا بعد میں ، جیسا کہ متذکرہ بالا مترجمین نے کیا بھی ہے ، اور یہی محاورہ ہے۔ درمیان میں بہت سے کا جوڑ کچھ غیر قدرتی سا لگا۔ میرے خیال میں موجودہ عربی عبارت کا ترجمہ یوں ہونا چاہئے۔ مرد بہت سے اور عورتیں ، جیسا کہ قرآن میں ہے، ممکن ہے یہ بات میرے ذہن میں عربی محاورے سے ناواقفیت کی وجہ سے ہی آئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو شرمندگی کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔

چونکہ عربی عبارت میں مرد کے بعد بہت سے، اور پھر عورتیں ہے اس لئے مجھے خیال آیا کہ کیا یہ ایک ایسی حقیقت کی طرف خفیف سا اشارہ یا علامت تو نہیں ہے جس کا اگر اس دور میں انکشاف کر دیا جاتا تو اس کا کوئی اطمینان بخش ثبوت فراہم کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ حقیقت دنیا کی آبادی میں مردوں اور عورتوں کا تناسب اب تو یہ بات ایک واضح حقیقت کہ دنیا کی آبادی میں مرد زیادہ اور عورتیں کم ہیں۔ فی الوقت (۲۰۰ء میں) مردوں کی آبادی عورتوں سے لگ بھگ چار کروڑ ستر لاکھ (۷۰۰۰۰۰۰، ۴) یا 0.76 زیادہ تھی ۔ دنیا کے تمام بڑے ملکوں چین، ہندوستان بنگلہ دیش، پاکستان، مصر، ایران، نائجیر یا وغیرہ وغیرہ میں مردوں کی آبادی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اورز یادہ رہی ہے۔ (Statistics) کے ایک قانون Low of Inertia of Large Numbers کے تحت اس میں تبدیلی آنا لگ بھگ محال ہے۔ میرا خیال ہے اسی کا خفیف سا اشارہ آیت کی ساخت رجالا کثیراً ونساء میں ملتا ہے۔

اگر دنیا کی تاریخ کی صرف پچھلی صدی میں ہی لڑی جانے والی جنگوں میں مردوں کے

اتلاف اور دوسرے حادثات میں زیادہ تر مردوں کی اموات کی تعداد کو بھی شامل کیا جائے تو یہ تناسب مردوں کے حق میں اور زیادہ ہوجائے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی کوئی خاص وجہ بھی اب تک طے نہیں کی جاسکی ہے۔

ساتویں صدی کے عرب سماج میں جس میں بعض خاندانوں میں لڑکیوں کو زندہ دفن کردینے کے علاوہ مردوں کے اتلاف جان کے ان گنت بہانے ۔متواتر جنگیں، آپسی قتل وغارت گری ، لوٹ مار، صحرائی طوفان وغیرہ۔ موجود تھے۔ اگر وہاں کے لوگوں سے اس وقت یہ بات کہہ دی جاتی کہ مردوں کی آبادی عورتوں سے زیادہ ہے تو نہ صرف کسی کو یقین نہ آتا بلکہ وہ اس دعوے کو چیلنج بھی کرتے جس کا ثبوت فراہم کرنا اس وقت کے مادی حالات میں ناممکن ہوجاتا۔ ظاہر ہے اس وقت کی آبادی کا تعین کرنا تو ناممکن ہے مگر فی زمانہ عرب میں مردوں کی آبادی ۳٪ زیادہ ہے۔

رشوت اور کرپشن:

سورہ بقرہ کی ایک آیت کا آخری حصہ اس طرح ہے

وَلاَتَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ : ۱۸۸)

اورآپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور (نہ) مال کو حکام کے یہاں جھونک دو تاکہ لوگوں کے مال میں سے (جو) کچھ ہاتھ لگے ناحق خورد برد کرجاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔

اس آیت کے پہلے حصے، یعنی ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ یہاں تک کی بات تو عرب کے اس سماج میں آسانی سے سمجھی جاسکتی تھی مگر دوسرا حصہ۔ دوسروں کا مال خورد برد کرنے کے لئے اپنے مال کو حکام کے یہاں مت جھونکو جسے آج رشوت یا کرپشن کہا جاتا ہے اور ہمارا سماج طرح طرح کے scams میں پھنسا ہوا ہے، یہ صورت تو اس سماج میں اگر نا قابل فہم نہیں تھی تو نا قابل عمل تو بہر حال تھی۔

کرپشن اور رشوت ستائی کے رائج ہونے کے لئے ایک باقاعدہ حکومت،اس کا افسر شاہی (بیوروکریٹیک) ڈھانچہ اور اس کی تمام تر کمزوریاں کنٹرول ، لائنس وغیرہ کے قوانین ، ان سے بچ نکلنے کے غیر قانونی ذرائع اور خصوصاً ایسی معیشت کا ہونا ضروری ہے جو پوری طرح زر بنیاد

(money-based) ہو۔ جزیرہ نمائے عرب میں اس وقت زیادہ بڑا حصہ قبائلی نظام کے تحت چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر، گلا بانی، شکار، کچھ کھیتی باڑی، کھجور وغیرہ کے باغات کے اور کچھ تجارت کی بنیادوں پر زندگی گزار نا تھا۔ زیادہ تر خرید وفروخت بارٹر (Barter) نظام پر مبنی تھی۔ نہ افسر تھے نہ اپنی کرنسی۔

پھر آیت میں لفظ ،حکام ، کو اگر منصفوں یا ججوں کے مترادف بھی مان لیا جائے ، جیسا کہ کچھ مفسرین کا خیال ہے تو وہاں یمن کے علاوہ کوئی باقاعدہ عدلیہ کا نظام بھی نظر نہیں آتا جان ومال کے آپسی قضیوں کا فیصلہ عام طور پر تلوار کرتی تھی ،کبھی کبھی قبیلے کے سرداروں کے درمیان گفت وشنید یا کسی تیسرے فریق کی مصالحت کی کوشش ضرور تھی۔ اس آیت میں قرآن کریم نے وہ بات کہی ہے جو دنیا کے بیشتر حصے میں انیسویں بیسویں صدی کے حالات سے بہت زیادہ مناسبت اور مطابقت رکھتی ہے۔ ساتویں صدی کے عرب میں اس کا قابل عمل (applicable) ہونا بعید از قیاس لگتا ہے۔ بہر طور یہ بات کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو اسلام میں رشوت لینے دینے کو مطلقاً حرام نہ کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے میرے خیال میں یہ آیت قرآن کریم کی اس گہری بلکہ معجز نما سماجی بصیرت کا بہترین نمونہ ہے جو سماج کی تمام گھناؤنی برائیوں کی پیش بندی کرنا چاہتی ہے۔

اورآخر میں سماجیات سے متعلق یہ آیت إِنَّ اللّٰہَ لاَیُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنفُسِہِمْ (بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے نفسوں (دلوں) کو نہیں بدلتے۔)اس آیت کے مفہوم کو

مولانا حالؔی نے یہ کہکر بیان کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اس آیت کے بارے میں اس وقت صرف اتنا کہہ کر کہ یہ قوموں کے عروج وزوال ، دنیا میں سیاسی ، سماجی ، ہر طرح کے انقلابات اور انسانی سماجیات کی طویل تاریخ کا عنوان ہے۔ اور اس دعا کے ساتھ کہ خدا ہماری قوم کے ایک ایک فرد، بچے، بوڑھے اور سبھی جوان کو اسے سمجھنے اور اپنے دل میں اتار لینے اور اس کا عملی طور پر اثر قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔